سب نوروں سے بڑھنے والا نور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ہے کیونکہ آپؐ کا ظرف بہت بڑا تھا۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 23 رفروری 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے فرمایا:

رمضان مبارک بہت سی برکتیں لے کے آیا اور بہت سی برکتیں پیچھے چھوڑ گیا اور بہت سی برکتیں ساتھ لے گیا خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے ان برکتوں سے حصہ پایا جو رمضان مبارک پیچھے چھوڑ گیا اور محروم ہیں وہ جو کچھ برکتیں رمضان کے مہینے میں حاصل تو کرتے رہے مگر جب وہ نکلا تو سب برکتیں ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔

برکت وہی ہے جو دائمی طور پر ساتھ رہتی ہے برکت وہی ہے جو آ کر ٹھہر جاتی ہے اور پھر کبھی انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتی باقی یونہی نفس کی لذتیں ہیں، اگر ہیں، ورنہ محض ایک مشقت ہی تھی اور کچھ بھی نہیں۔ جنہوں نے لذّت پائی ہو اور وہ لذّت وقتی ہو اس میں کوئی دوام کا پہلو نہ ہو۔ وہ لذّت بھی ایک فرضی روحانی لذّت ہے، روحانی لذّت سے اس کا تعلق نہیں۔ روحانی لذّت میں ابدیت پائی جاتی ہے اور یہ ایک بہت بڑا فرق ہے اور امتیاز کرنے والا فرق ہے جو روحانی لذّت اور مادی لذّت میں پایا جاتا ہے اور غور کرنے سے صاف کھلا کھلا دکھائی دینے لگتا ہے۔

مادی لذّت جب آ کے گزر جاتی ہے تو پیچھے ایک تکلیف دہ یاد چھوڑ دیتی ہے۔ اس لذّت میں ایک قسم کا مزہ بھی ہے مگر اس مزے کے ساتھ ایک تلخی بھی وابستہ ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے۔

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

اچھا کیا مجھ کو فراموش کر دیا

مگر یہ مضمون بعینہٖ اس طرح تو پورا نہیں آتا مگر اچھی یادوں کے ساتھ تلخیاں ویسے ہی وابستہ ہوتی ہیں کیونکہ وہ یادیں کھوئے ہوئے مضمون سے تعلق رکھتی ہیں ایسی (محمد حسن لطفی) چیز جو پیاری لگی اور اب نہیں ہے۔ مگر وہ یادیں جو ایک دائمی وجود سے تعلق سے وابستہ ہوں یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کے پیار، اس کی محبت کے اظہار کے جلوے، وہ یادیں ایسی ہیں جو ان جلوؤں سے، ان پیار کے اظہار سے وابستہ ہوں کہ وہ اپنی ذات میں ایک دوام رکھتی ہیں اور محرومی کا احساس نہیں چھوڑتیں۔ پس حقیقی نیکی وہی ہے یا حقیقی روحانی لطف وہی ہے جو دوام اپنے اندر رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جنت کو دائمی قرار دیا گیا ہے۔

اس سے پہلے میں نے خطبے میں مختصراً، غالباً عید کے خطبے میں ہی عذاب کے متعلق ذکر کیا تھا، تکلیف کے متعلق ذکر کیا تھا کہ اس میں دوام نہیں پایا جاتا مگر تھوڑا ہونے کے باوجود لمبا دکھائی دیتا ہے اور جتنا اس سے دور ہٹتے چلے جاتے ہیں اتنا ہی لطف بڑھتا جاتا ہے اور اس کی یاد محض ان معنوں میں فائدہ دیتی ہے کہ شکر ہے اب ہمارا تعلق ٹوٹا اور اس تعلق کے دوبارہ قیام سے ہی جسم لرز اٹھتا ہے تو تلخ یادوں میں جتنی دوری ہو اتنا لطف بڑھتا ہے اچھی اور پیاری یادوں میں جتنی دوری ہو اتنی تکلیف بڑھتی ہے کہ کیا ہوئے وہ دن جن میں یہ کچھ ہوا کرتا تھا۔ بعض شعراء اپنے بچپن کی یادوں کو پھر اتنا پیار دیتے ہیں اور اتنے پیار سے پالتے ہیں کہ وہ یادیں ان کی راتوں کی لوریاں بن جاتی ہیں۔

ایک انگریزی نظم کا کسی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے اور ترجمہ ایسا کیا کہ گویا اس نظم کو اپنا گیا ہے اور میں نے دونوں کا موازنہ کر کے دیکھا ہے جو ترجمہ ہے وہ اپنی خوبی میں اصل سے بھی اونچا نکل گیا ہے اور وہ نظم ہے۔

اکثر شب تنہائی میں، کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں، بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی، اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر

اسی طرز پر وہ مضمون کو بڑھاتا ہے۔ (ترجمہ: نادر کاکوروی)

وہ بچپن اور وہ سادگی، وہ رونا وہ ہنسنا کبھی

پھر وہ جوانی کے مزے، وہ دل لگی، وہ قہقہے

غرض یہ کہ ہر پرانی یادکو وہ رات کو اس طرح اپنے سینے سے چمٹا تا (ترجمہ: نادر کاکوروی) ،اپنے دماغ میں الٹ پلٹ کے اس کے مزے لیتا ہے کہ وہی اس کی لوریاں بن جاتی ہیں مگر حسرت پھر نہیں جاتی۔ ان چیزوں کو واپس لانے کی جو حسرت ہے وہ اس نظم میں جوں جوں آگے بڑھتی ہے وہ اور کھلتی چلی جاتی ہے۔''ان حسرتوں کی قبر پر'' پھر آخر پر وہ یہ کہتا ہے کہ وہ یادیں پتیاں برسا رہی ہیں پھول کی ان حسرتوں کی قبر پر۔

تو وہ چیزیں، جو یادیں ایسی ہوں جن میں دوام پایا جائے ان میں حسرت کوئی نہیں ہوتی اور نور میں بھی یہی ایک خوبی پائی جاتی ہے کہ وہ نور جو خدا کا نور ہے وہ آتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے اور اندھیرا پھر اس کی جگہ دوبارہ نہیں لے سکتا۔ وہ مستقلاً زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے جو جگہ بنالے وہ بنا بیٹھتا ہے۔ اس لئے انبیاءؑ کا نور ہمیشہ دائمی ہوتا ہے۔ انبیاءؑ کے اوپر کوئی ایسا دور نہیں آتا کہ جو نور انہوں نے خدا کی محبت اور پیار میں کمایا ہو وہ نور ظلمتوں نے واپس چھین لیا ہو۔ وہ بڑھتا ہے، پھولتا ہے، پھیلتا ہے اور جگہیں بناتا چلا جاتا ہے، بدن کے روئیں روئیں میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے اور اس میں ایک دوام پایا جاتا ہے۔ وہی دوام ہے جو جنت بنے گا۔ جیسا کہ تلخ تجربہ جو ہے وہ اپنی ذات میں اگر لمبا ہو جائے تو ایک عذاب بنتا ہے اور تھوڑا بھی ہو تو اس میں ایک لمبائی کا مضمون پایا جاتا ہے۔ چند لمحے عذاب کے بعض دفعہ ساری زندگی کو تلخ کر دیتے ہیں۔ تو جہنم میں بھی جس حد تک دوام ہے وہ اسی حد تک ہے کہ خواہ تھوڑی بھی ہو، وہ سزا ابدی تو بہر حال اس رنگ میں نہیں ہوگی، جس رنگ میں جنت ہے مگر تھوڑی بھی ہو تو یوں لگے گا جیسے ابد ہو رہی ہے انسان پر، ایک دو لمحے بھی گزرنے کا نام نہیں لیں گے مصیبت پڑ جائے گی۔ بعض گھڑیاں تکلیف میں اتنی بڑی ہو جاتی ہیں کہ قرآن کریم ان کے متعلق فرماتا ہے کہ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (الانعام: 16) یہ ایک عظیم دن کا عذاب ہے جو دن ختم ہونے میں نہ آئے۔ تو دنوں کا لمبے اور بڑے ہو جانا اس کا تعلق عذاب سے ہے اور سکڑ جانا اور اس کے باوجود ختم نہ ہونا اس کا تعلق نیکی اور ثواب سے ہے وہ ثواب جو اللہ کی طرف سے آتا ہے وہ ان معنوں میں دوام پکڑتا ہے کہ اس لذّت کی یاد ہمیشہ دل میں ٹھہرتی ہے اور لطف پیدا کرتی ہے کوئی حسرت نہیں پیدا کرتی

کیونکہ لذّت ایک زندہ لذت ہے۔ جس کے ساتھ تعلق ہوگا جس نے احسان فرمایا اس نے احسان سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ جس نے پیار کی نظر ڈالی اس نے نظر پھیری نہیں اور بے اختیار ایسے شخص کا دل یہ پکار اٹھتا ہے۔ **سبحان من یرانی** ۔ پاک ہے وہ ذات جو ہمیشہ مجھے دیکھتی چلی جارہی ہے، ہر لمحہ میں اس کی نظر کا پیار محسوس کرتا ہوں۔

پس ان معنوں میں رمضان مبارک جو آ کے گزر گیا ہے وہ کچھ ایسی لذتیں عطا کر گیا جو دوام رکھتی ہیں اور وہ کبھی مٹ نہیں سکتیں۔ جن بدیوں کو مٹا گیا وہ پھر زندہ نہیں ہوسکتیں۔ جن نیکیوں کو قائم کر گیا ان کو پھر کوئی چیز جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک نہیں سکتی۔ یہ وہ دائمی لذت ہے جن سے ہم اپنی آئندہ جنت بنائیں گے اور بنا رہے ہیں اور اس کا فیصلہ اسی دنیا میں ہوجاتا ہے۔

ابھی رمضان کو گزرے جمعہ، جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے کیونکہ جو پچھلا جمعہ تھا وہ رمضان کے اندر تھا اس کے بعد بھی ہم نے تین دن یا چار دن رمضان کے دیکھے تو اب دیکھ لیجئے کہ اتنے تھوڑے سے وقفے میں بھی رمضان بعض لوگوں کو اپنے سے کتنا دور ہٹا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اتنا دور چلا گیا ہے کہ وہ چیزیں جن کی کبھی جرأت کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا ان کی طرف طبیعتیں مائل ہورہی ہیں، انہی غفلتوں کی طرف انسان لوٹ رہا ہے، وہ تہجد کی رونقیں ختم، صبح کی نمازیں بھی قضا ہونے لگیں اور لوگ مزے کی نیندیں سونے لگے کہ اب رمضان کی تھکاوٹ دور کرلیں۔ حالانکہ رمضان کی تھکاوٹ تو قرب الٰہی دور کیا کرتا ہے اس کے سوا تو رمضان کی تھکاوٹ دور نہیں ہوسکتی۔ جس چیز کو آپ تھکاوٹ دور کرنا کہتے ہیں وہ تھکاوٹ کی طرف لوٹنا ہے اس کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ دنیا کی مشقت اور محنت ایک بے معنی اور بے حقیقت تھکاوٹ ہے جس کے آگے کوئی جنت نہیں ہے۔ اس کے آگے سراب ہے۔ تھکاوٹ جس کا نتیجہ سراب ہے۔

چنانچہ قرآن کریم ایسے شخص کی مثال جو دنیا کی لذتوں کی طرف دوڑ رہا ہے ایسے شخص سے دیتا ہے جو پیاسا بہت ہو مگر سراب کی طرف دوڑ رہا ہو۔ اسے دور سے پانی دکھائی دے لیکن وہ پانی نہیں نظر کا دھوکہ ہو اور صحرا میں جو لق و دق صحرا ہو اس میں پانی کی بوند بھی دکھائی نہ دے وہیں وہ پانی دکھائی دیتا ہے جو نظر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کی پیروی کرتا ہے دوڑتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ تھک کر وہ جگہ جہاں اس کا دم ٹوٹتا ہے وہ وہی سراب کا مقام ہے جہاں کچھ بھی نہیں ہوتا

سوائے اس کے کہ اللہ اسے جزاء دینے کے لئے وہاں موجود ہو۔ تو دنیا کی لذّتوں کی بھی ایک تھکاوٹ ہے اور امر واقعہ ہے کہ جو لوگ غور کریں ان کو محسوس ہوگا کہ ضرور اس میں تھکاوٹ پائی جاتی ہے کیونکہ انسان جو دنیا کی لذّتوں کی طرف دوڑتا ہے اور مگن ہو کر پیروی کرتا ہے جہاں پہنچتا ہے کہ اب مجھے کامل تسکین نصیب ہو جائے گی اسے کامل تسکین نصیب نہیں ہوتی۔ وہی جگہ جو بہت ہی پیاری دکھائی دیتی تھی وہ لذّتوں سے خالی ہوتی ہے اور خالی ہونے میں وقت نہیں لیتی۔ تھوڑی دیر ہی میں آناً فاناً اس کا حسن زائل ہو جاتا ہے، اس کے حسن کی عادت پڑ جاتی ہے، اس کا آرام مزید آرام نہیں رہتا، اسی آرام میں کچھ تکلیف محسوس ہونے لگتی ہے اور انسان بہتر اور اعلیٰ لذّتوں کی طرف یعنی نسبتاً کامل حسن کی طرف، زیادہ آرام کی طرف حرکت شروع کرتا ہے۔ اگر نہ کرے تو جس کو اس نے جنت سمجھا تھا وہ اس کی بوریت بن جائے گی۔ وہ ایک جگہ ٹھہر کر دنیا کی پیروی میں کوئی ایسا مقام قرار نہیں دے سکتا کہ میں اب یہاں ٹھہر گیا ہوں یہاں میری تسکین ہے۔ سراب کی طرح اس کی تسکین اس کے آگے دوڑتی ہے اور اس سے ہٹتی ہوئی دور دکھائی دیتی ہے اور پھر وہ کوشش کرتا ہے اور پھر اس سے یہی ہوتا ہے منزل بہ منزل اس کی لذّتیں اس سے بھاگتی چلی جاتی ہیں۔ جب وہ پاتا ہے تو تھکاوٹ تو پاتا ہے لیکن وہ تھکاوٹ دور نہیں ہوتی۔ وقتی طور پر ایک جھلکی سی محسوس ہوتی ہے کہ مجھے امن ملا ہے لیکن تھوڑی دیر میں وہ امن کا تصور غائب، وہ حسن کو پالینے کا لطف جاتا رہتا ہے صرف ایک پیروی، دوڑ کی تمنا ہے جو اسے پھر اور آگے لے جاتی ہے۔ یہ سراب کی پیروی ہے۔

مگر جو دینی لذّتیں ہیں انکی بالکل اور مثال ہے ان میں جو آپ نیکی کما لیں وہ ہمیشہ کے لئے آپ کی تسکین کا موجب بن جاتی ہے۔ بعض ایسی نیکیاں ہیں کہ جو اپنی تکلیف کے لحاظ سے تو تھوڑی دیر رہ کر گزر گئیں مگر اپنے سکون کے لحاظ سے وہ کبھی بھی مٹتی نہیں یہاں تک کہ مدّتوں ان کی یاد دل کی تسکین کا موجب بنتی ہے۔ جب انسان کو خوف دامن گیر ہو جائیں تو وہی ایک آدھ نیکی جو کسی وقت اس کو توفیق ملی وہ ایک ہی سایہ رہ جاتا ہے جس میں وہ ماحول کی تکلیف اور اس کے عذاب سے امن ڈھونڈتا ہے وہاں کچھ تسکین پاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ ایسے آدمیوں کی مثال پیش کرتے ہیں کہ تین آدمی ایک غار میں اس طرح پھنس گئے کہ زلزلے کی وجہ سے ایک بہت بڑا پتھر اُن کے سامنے آ گیا اور وہ اس سے نکل نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے بھی یہی نفسیاتی تسکین کی راہ ڈھونڈی اور آپس میں

باتیں کیں کہ ہم کوئی ایسی نیکی سوچیں جس نیکی کی یاد ہمارے دل میں ابھی بھی تر و تازہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ خدا کو وہ پسند آئی ہوگی اور اس نیکی کی یاد کر کے، اس کا حوالہ دے کر خدا سے دعا مانگتے ہیں یہ پہلے آپ کے سامنے کئی بار میں بیان کر چکا ہوں۔ مختصر یہی کہ انہوں نے اپنی اپنی اس نیکی کی یاد کی جو ابھی تک ان کے ذہن میں تازہ تھی اور اتنا یقین تھا کہ یہ نیکی اتنی پیاری ہے کہ خدا اس کے حوالے سے دعا کو ضرور قبول کرے گا۔ انہوں نے اس نیکی کا ذکر دعا میں کیا اور اللہ سے عرض کیا کہ اگر واقعۃً یہ تیری خاطر ایسا کیا گیا تھا تو اس پتھر کو ہٹا دے اور وہ پتھر کسی حد تک ایک اور زلزلے کی جنبش سے سرک کر آگے سے ہٹ گیا لیکن ابھی نکل نہیں سکتے تھے یہاں تک کہ دوسرے نے بھی اسی طرح اپنی پرانی نیکی کو یاد کیا اور پھر ایک تیسرے نے بھی۔

یہ تو انفرادی نیکیوں کا حال ہے مگر نہ صرف یہ کہ وہ لذّتیں رکھتی ہیں، فائدے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔ یہ دوسرا پہلو ہے جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ نیکی مرتی نہیں ہے صرف یاد کے طور پر زندہ نہیں رہتی اس میں نشو ونما کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ان تین کی مثال جن کی آنحضرت ﷺ نے مثال دی ان کی مثال ایسے اشخاص کی مثال تھی جو بدیوں سے رکے ہیں۔ حقیقت میں انہوں نے نیکیاں نہیں کی تھیں۔ ان کے بدیوں سے رکنے کے نتیجے میں وہ ادا خدا کو پسند تو آئی اس کو خدا نے دعا کے حوالے میں قبول بھی فرمایا مگر ان میں سے کسی ایک کے لئے اس کی ایک نیکی نجات کا موجب نہیں بن سکتی تھی اور یہاں جب اجتماعی نیکی بنی ہے۔ تب ان کو نجات ملی ہے۔ اس حصّے پر بھی غور کرو کہ ایک شخص کی نیکی کے نتیجے میں جو بدیوں سے بچنے والی نیکی تھی وہ اکیلا بھی نجات نہیں پاسکا اور اس کی اکیلے کی دعا سے پتھر اتنا نہ سرکا کہ وہ اس کے رستے سے نکل جاتا اور دوسرے بھی فائدہ اٹھاتے۔ دوسرے نے جب دعا کی تو پھر سرکا کہ بمشکل گھسٹ کے شاید کوئی آدمی نکل سکتا ہو مگر جو مضمون بیان ہوا ہے اس سے لگتا ہے کہ اتنا راستہ نہ بن سکا تھا کہ اس سے انسان گزر سکتا اور تیسرے نے جب دعا کی تو اتنا سرک گیا کہ اس میں سے ایک آدمی نکل سکتا تھا چنانچہ تینوں اس میں سے نکل گئے۔

انبیاءؑ کی نیکی کا مقام بہت بلند ہے اور ابرار کی نیکی کا مقام بھی اس سے بہت بلند ہے۔ اس لئے وہ لوگ جو اس نیکی کی مثال سے متاثر ہو کر سمجھتے ہیں کہ اسی قسم کی کوئی ایک نیکی ہمارے لئے ہمیشہ کے لئے نجات کا موجب بن جائے گی۔ ان کو غور کرنا چاہئے کہ ان میں سے کسی کی نیکی بھی اس نجات

کا موجب نہ بن سکی کیونکہ اس میں ایک منفی پہلو تھا۔ بدی سے رکنا بھی ایک نیکی ہے مگر اگر اس کی جگہ اعلیٰ خوبیاں نہ لے لیں تو وہ نیکی نیکی نہیں رہتی۔ یہ اللہ کا احسان تھا کہ اس کو قبول فرمالیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مضمون پر بہت روشنی ڈالی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ ترکِ شر اپنی ذات میں کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی اگر اس کی بجائے خیر کو اپنانا اس کے ساتھ شامل نہ ہو، اس کا لازمی نتیجہ نہ نکلے۔ جہاں شر کو دور کرو وہاں خیر کو قبول کرو۔ وہ خیر ہے جو حقیقت میں ترکِ شر کا اجر ہے اور اس کے نتیجے میں تمہیں ایک مثبت چیز ایسی حاصل ہو جاتی ہے، ایسی دولت ہاتھ میں آجاتی ہے جو پھر خرچ کرنے پر کم نہیں ہوتی، بڑھتی ہے۔

چنانچہ حقیقت یہی ہے کہ بدی کے ترک کرنے کے ساتھ جو انسان کو روحانی قوت ملتی ہے اس سے نیکی کو قبول کرنے کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور ان لوگوں کا جن کا ذکر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ان لوگوں کا حال بنظر غور دیکھو کہ ان کو اس کے بعد کسی بڑی نیکی کی توفیق ملی نہیں ہے۔ اگر ملی ہوتی تو وہ اس نیکی کا ذکر کرتے۔ انہوں نے ایک پرانی ایسی نیکی کا ذکر کیا ہے کہ اے خدا ہم یہ شر کر سکتے تھے اس بدی میں مبتلا ہو سکتے تھے مگر تیرے خوف سے، تیرے ذکر سے مرعوب ہو کر ہم نے وہ کام نہیں کیا۔ اس کے بعد توفیق ملنی چاہئے تھی آگے بڑھنا چاہئے تھا مگر چونکہ وہ نہ کر سکے اس لئے ایک کی نیکی خود اس کے لئے بھی کافی نہیں ہوئی۔ تینوں کی نیکی نے مل کر ان کی نجات کے سامان کئے۔ مگر ابرار کی نیکی کا یہ حال ہے کہ ایک کی نیکی کثرت سے دوسروں کے کام آتی ہے اور ایسے لوگوں کے بھی کام آتی ہے جو گناہوں میں ملوث ہوں، جن کا کچھ بھی نہ ہو۔ بسا اوقات ان کی نجات کا موجب بھی بن جاتی ہے۔

اب دیکھیں آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان لوگوں کو جب تک تو اس شہر میں ہے میں عذاب نہیں دوں گا۔ (انفال: 34) کتنی عظیم بات ہے جو فرمائی گئی کہ تیرے ہوتے ہوئے عذاب دیا جائے تو یہ تیری شان کے خلاف ہے اور اس عذاب میں تو بھی کسی حد تک ملوث ہوگا اور پھر اپنی آنکھوں سے عذاب دیکھے گا تو تجھے بھی تکلیف پہنچے گی بہت سے مضامین ہیں اس میں۔ مگر ایک محمد رسول اللہ ﷺ کا وجود اہل مکہ کو عذاب سے بچا گیا جب کہ وہ دعائیں کرتے تھے کہ اے خدا اگر یہ سچا ہے ہم جھوٹے ہیں تو ہم پر پتھر برسا مگر اس وقت تک نہیں برسائے گئے جب تک حضرت محمد

رسول اللہ ﷺ ان میں جسمانی طور پر موجود رہے اور جب وہ مقابل پر نکلے تو جنگ بدر میں دیکھو ایک مٹھی پتھر بن گئی اور پتھروں کا طوفان لے آئی ایسا طوفان جس نے اس عظیم لشکر کے منہ پھیر دیئے اور ناکارہ اور ذلیل کر دیا۔ تو یہ مثبت نیکیوں کا حال ہے۔ ابرار کی نیکیاں اپنے لئے ہی نہیں بلکہ عالم کی نجات کا موجب بن جاتی ہیں۔ اس پہلو سے آنحضرت ﷺ وہ کامل نور تھے جنہوں نے بدیوں کا ازالہ ہی اپنی ذات سے نہیں کیا یعنی بدیوں کو قریب تک نہیں پھٹکنے دیا اور ہر پہلو سے اپنے وجود کو نور مجسم کر دیا۔ یہ وہ مضمون ہے جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نور کی تفسیر میں بڑے پیارے انداز میں بیان فرمایا ہے اور تمام انبیاءؑ کی یہی کیفیت بیان فرمائی ہے کہ اپنی اپنی حیثیت توفیق کے مطابق وہ یہ کچھ کرتے ہیں تو خدا کی نظروں میں جچتے ہیں اور خدا ان سے پیار کا وہ سلوک کرتا ہے جو عام انسانوں سے نہیں کرتا۔

پس اس رمضان المبارک کے حوالے سے بھی ہمیں اپنے نفس کو ٹٹولنا چاہئے، اپنے تجربے کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر یہ دیکھنا چاہئے کہ کون سا حصّہ رمضان کا ایسا ہے جس کو ہماری ذات میں کچھ دوام ملا ہے۔ کون سا رمضان کا حصّہ ہے جو ہمارے ساتھ ٹھہر گیا ہے، ہمارے ساتھ ہمارے بدن میں ٹھہر گیا ہے اور ہمارے ساتھ حرکت کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اگر نہیں ہے تو پھر وہ ترکِ شر یعنی بدیوں سے رکنا یا گالیاں نہ دینا یا اور خدا کی خاطر بعضوں کے ظلم برداشت کر لینا وہ تو ماضی میں دب جائیں گے اور ان کا کچھ بھی ایسا فائدہ نہیں ہے جو آپ کو مستقلاً نجات کی طرف لے جائے۔ مستقلاً نجات کی طرف جانا یہ اصل مضمون ہے جس کو سمجھنا ضروری ہے یعنی نیکی وہ ہے جو ہاتھ پکڑ لیتی ہے، آگے بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ کہیں بھی دامن نہیں چھوڑتی اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ آپ نیکی پر اس پیار اور محبت سے ہاتھ ڈالیں کہ اسے اپنانے کی کوشش کریں۔ وہ آپ کو واقعۃً اتنی اچھی لگنے لگے کہ وہ چھوڑی نہ جائے۔ اس سے محبت ہو جائے اس سے پیار ہو جائے اور یہی ہے جو دراصل نور کمانے کا ایک ذریعہ ہے ورنہ محض نور کی باتیں کرنا فرضی قصّے ہیں ان کی کوئی اور حقیقت نہیں ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جو تحریرات میں آپ کے سامنے پیش کر رہا تھا اب ان میں سے جو بعض رہ گئی تھیں یا کچھ حصہ شاید میں پڑھ بھی چکا ہوں مگر یہ جو صفحہ میرے سامنے ہے اس کا ایک حصّہ تو یقیناً رہ گیا تھا جہاں سے بات آگے بڑھانی تھی۔ اس تعلق میں جو تمہید باندھی ہے اس کا

اس سے گہرا تعلق ہے یہ میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں۔

> فیضان کے لئے مناسبت شرط ہے اور تاریکی کو نور سے کچھ مناسبت نہیں بلکہ نور کو نور سے مناسبت ہے اور حکیم مطلق بغیر رعایت مناسبت کوئی کام نہیں کرتا۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم، حاشیہ نمبر 11 روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 195)

حکیم مطلق جسے عقل کل بھی ایک موقع پر فرمایا یعنی کامل حکمتوں والا وہ ایک ہی ہے جو خدا کی ذات ہے وہ مناسبت کے بغیر کوئی فعل نہیں کرتا۔نور کو ظلم سے نہیں ملاتا یہ نامناسب بات ہے۔کہتے ہیں ایک قطرہ بھی گندگی کا ڈھیروں دودھ میں ملا دو تو سارا دودھ گندا ہو جائے گا تو یہ غیر مناسب فعل ہے غیر حکیمانہ فعل ہے۔پس حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ نور اترتا ہے مگر انہی جگہوں پر جنہیں پہلے صاف کر لیا جائے اور انہیں گندگیوں سے پاک کیا جائے اور اندرونی نور انسان کو نصیب ہو، تاکہ اس نور پر نور اترے۔جیسے آپ بھی باہر سفر کے دوران کسی جگہ بیٹھنا چاہیں تو بعض دفعہ ہاتھ سے یا رومال نکال کے وہ جگہیں صاف کرتے ہیں پھر بیٹھتے ہیں۔آپ کو اگر صفائی کا یہ احساس ہے اور اس قدر اہتمام ہے کہ جب تک صاف نہ کر لیں آپ کے کپڑے بھی اس معمولی سی میل کو نہ چھوئیں تو اللہ کی شان کے خلاف ہے کہ **نعوذ باللہ من ذالک** ہر گندگی پہ اپنا نور اتارتا رہے۔یہ ناممکن ہے۔اس لئے کوئی گوشہ تو صاف کرنا ہوگا۔

کسی گھر میں اگر کوئی اچانک معزز مہمان آجائے سارے گھر کی تو صفائی ممکن نہیں ہوتی مگر بچے اور عورتیں دوڑتے ہیں کہ کم سے کم کچھ حصّہ تو صاف کر لیں اور وہ بیٹھنا چاہے بھی تو بیٹھنے نہیں دیں گے ذرا ایک منٹ ٹھہریں، ایک منٹ موقع دیں ذرا ہم اس سیٹ کو صاف کر لیں۔یہ آپ کے بیٹھنے کے لائق نہیں ہے۔انسان انسان کی عزت کرتا ہے تو یہ سلوک کرتا ہے۔کیسے ممکن ہے کہ خدا کی عزت کا احساس اس کے دل میں ہو اور اپنے دل کو صاف کئے بغیر کہے مجھے نور عطا کر۔عطا تو وہ کرے گا پر وہ اترے گا کہاں؟ جگہ کون سی تم نے بنائی ہے جہاں آکر وہ بیٹھے گا اور قیام کرے گا اور اگر تم نے جگہ بنا دی تو یاد رکھو کہ پھر وہ نور خود اپنے اردگرد روشنی کو اس طرح پھیلاتا ہے کہ اس کے قریب سے گند دور ہونے لگتا ہے۔وہ گندگی پر نہیں آتا مگر ماحول سے گندگی اس کا خوف کھاتی ہے اور اس سے پرے ہٹنے

لگتی ہے۔یہی مضمون ہے جو ہم دنیا میں ہالوں کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ایک روشنی کسی جگہ مرکز ہوتی ہے اوراس کے اردگرد ایک ہالہ بن جاتا ہے اور ظلمت سر کنے لگتی ہے۔اس جگہ کو چھوڑتی ہے اور بھاگتی ہے جہاں نور اتر آیا ہے۔

اسی مضمون کو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل:82) حق سے باطل گھبراتا ہے جیسے نور سے ظلمت گھبراتی ہے اور جہاں وہ ایک دفعہ جگہ بنالے اردگرد سے تاریکیاں زائل ہونے لگتی ہیں شروع میں سایہ دار جگہ دکھائی دیتی ہے کچھ اندھیرے، کچھ روشنی مگر پھر جب پوری پاکی اور صفائی عطا ہوجائے تو نور پھیل کر اپنی جگہ اور بنالیتا ہے۔یہ وہ مضمون ہے جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام ان الفاظ میں کھول رہے ہیں:

> نور کو نور سے مناسبت ہے اور حکیم مطلق بغیر رعایت مناسبت کوئی کام نہیں کرتا۔ایسے ہی فیضان نور میں بھی اس کا یہی قانون ہے کہ جس کے پاس کچھ نور ہے اسی کو اور نور بھی دیا جاتا ہے اور جس کے پاس کچھ نہیں اس کو کچھ نہیں دیا جاتا۔جو شخص آنکھوں کا نور رکھتا ہے وہی آفتاب کا نور پاتا ہے اور جس کے پاس آنکھوں کا نور نہیں وہ آفتاب کے نور سے بھی بے بہرہ رہتا ہے اور جس کو فطرتی نور کم ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی کم ہی ملتا ہے اور جس کو فطرتی نور زیادہ ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی زیادہ ہی ملتا ہے اور انبیاء من جملہ سلسلہ متفاوتہ فطرت انسانی کے وہ افراد عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نور باطنی عطا ہوا ہے کہ گویا وہ نورِ مجسم ہو گئے۔

(براہین احمدیہ حصّہ سوم، حاشیہ نمبر 11 روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 195 تا 196)

انبیاءؑ وہ انسان ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اول فطرتاً اپنا نور ودیعت فرمایا، نورِ حق ودیعت فرمایا اور پھر انہوں نے اپنے سارے وجود کو اس نور میں رنگ دیا ہے جیسے مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ع دل کو ان نوروں کا ہر رنگ دلایا ہم نے

(آئینہ کمالات اسلام روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 225)

یہاں وہبت کے ساتھ کسب شامل ہو جاتا ہے۔ ایک نور ہے جو فطرت میں ودیعت ہوا ہے اور ہر انسان کو ضرور نور عطا ہوا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی انسان بھی نور کے بغیر پیدا ہو۔ اگر آپ حواسِ خمسہ پر غور کریں تو یہ مضمون اور بھی کھل جائے گا۔ جو حواسِ خمسہ میں سے کچھ بھی نہیں رکھتا وہ مر گیا ہے، وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ نور سے مراد صرف آنکھوں کا نور نہیں ہے۔ نور سے مراد وہ ذریعہ ابلاغ ہے جو باہر کے حالات کو روح کے اندر تک پہنچاتا ہے اور ذہن کے آخری نقطے میں جو شعور کا آخری نقطہ ہے باہر کی دنیا کی باتیں معلوم ہونے لگتی ہیں جن کا اس ذریعہ ابلاغ کے سوا معلوم ہونا ممکن ہی نہیں۔ پس اگر ایک آدمی اندھا ہے، بہرہ ہے، گونگا ہے، اگر وہ لمس کی صفت بھی نہیں رکھتا، اگر مثبت صفات سے عاری ہے اور منفی صفت بھی نہیں رکھتا، یعنی بھوک محسوس نہیں کرتا، دکھ محسوس نہیں کرتا، جلن کا احساس نہیں، سردی کا گرمی کا احساس نہیں، نہ سنتا ہے، نہ بولتا ہے تو مردہ اور کس کو کہتے ہیں۔ پس کوئی انسان ایسا نہیں جو نور کے بغیر ہو اور ہم اسے زندہ کہہ سکیں۔ ہر انسان کو خواہ وہ کمزور ہے یا زیادہ ہے کچھ نہ کچھ نور فطرت عطا ہوا ہے اور جس حد تک کسی کو نور فطرت عطا ہوا ہے اسی حد تک اللہ تعالیٰ کا نور اس سے رابطہ کرتا ہے اگر وہ چاہے۔ اگر اس کی توجہ اس طرف ہو اور اپنے نور کو نور الٰہی سے ملانے کے لئے وہ محنت کرے جس کو کسب کہتے ہیں واقعۃً توجہ کرے۔

اس محنت کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ملتا ہے يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (الانشقاق:7) یعنی اے انسان نور تو تجھے عطا ہوا ہے نورِ فطرت سے تو کسی کو بھی خدا نے خالی نہیں چھوڑا مگر ملے گا وہی خدا سے جس کے متعلق فرمایا: اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا تو اپنے رب کی طرف جانے کے لئے بڑی محنت کر رہا ہے فَمُلٰقِيْهِ پس یاد رکھ کہ تیری محنت کام آئے گی اور رائیگاں نہیں جائے گی جس طرح دنیا کی محنت کو پھل لگتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میری طرف آنے کے لئے تو نے جو محنت کی یا جو کرے گا یا کر رہا ہے میں تجھے خوشخبری دیتا ہوں فَمُلٰقِيْهِ تو اپنے اس رب کو پالے گا جس کے لئے تو محنت کر رہا ہے۔

یہی محنت تھی رمضان کی جس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ روزے کی میں جزا ہوں کیونکہ یہ محنت خدا کی طرف تھی۔ پس اگر کوئی پھل نہ لگا ہو اگر ہمارے اندھیرے کسی معنوں میں بھی روشنی میں تبدیل نہ ہوئے ہوں تو ہم پر نہ اس آیت کا اطلاق ہوتا ہے نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم

نے اس رمضان سے کوئی ادنیٰ بھی نور کمایا ہے کیونکہ خدا کا وعدہ جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ فرماتا ہے اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا اے انسان ضرور تو محنت کرے گا اور کر رہا ہے اور اِنَّكَ میں جو مضمون ہے یہ شرط پیدا کر رہا ہے بڑی شدت کے ساتھ کہ یاد رکھ تیرے لئے لازم ہے کہ محنت کرے یہ معنی بھی اسی میں سے نکل رہا ہے ہاں ہم جانتے ہیں کہ تو ضرور محنت کر رہا ہے اور كَدْحًا اس لفظ کو اس کے Infinitive کو، اس کے مصدر کو زور پیدا کرنے کے لئے دہرایا ہے کہ بڑی محنت کر رہا ہے تو فَمُلٰقِيْهِ پس خوشخبری ہو کہ تو اسے ضرور پالے گا۔ پس یہ جو پانا ہے یہ نور کمانے والی بات ہے جس کو اردو میں ہم نور کمانا کہتے ہیں۔ نور تو ہے مگر اس کو صیقل نہیں کیا گیا اور دروازے کھولے نہیں گئے اور غفلتوں اور سستیوں کے پردوں کو ہٹا کر آسمان کے نور کو اندر پہنچنے کے لئے رستہ نہیں دیا گیا ہو تو اندر کا نور کچھ بھی کام نہیں آسکتا۔ پس یہ تین چیزیں ہیں جن کا اکٹھا ہونا ضروری ہے۔ ایک اندر کی صلاحیت اور وہ نور جو خدا عطا کرتا ہے پیدائش کے وقت ہر انسان کو حصہ رسدی اس کی توفیق کے مطابق جو توفیق خدا کی تقدیر نے بنائی ہوتی ہے اس کو ایک نور ملتا ہے۔ پھر كَدْحًا کے دور میں وہ ڈالا جاتا ہے اور ایسی آزمائشوں میں مبتلا کیا جاتا ہے جہاں اس کو اس نور کو چمکانے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے اور ان روکوں کو دور کرنا پڑتا ہے جو غفلت کی وجہ سے ایسے نوروں کی راہ میں ضرور حائل ہوتی ہیں۔ غفلت کی مثال نیند کی ہے۔ اب سورج چمک بھی رہا ہو تو تھکے ہوئے آدمی کو عین دوپہر کو سورج کے نیچے بھی نیند آجاتی ہے اور آنکھیں کھولنا بھی چاہے تو مند جاتی ہیں پھر کچھ بھی اس کو دکھائی نہیں دیتا۔ تو وہ شخص جو اپنی آنکھوں کو کھولنے کے لئے محنت نہیں کرتا اس پر نیند کا غلبہ آجائے وہ غفلت کی حالت میں اس روشنی کے وقت سے محروم رہ جاتا ہے اور جہاں تک روحانی آنکھوں کا تعلق ہے ان کا مضمون اس سے زیادہ گھمبیر اور مشکل ہے جو ظاہری روشنی دیکھنے والی آنکھوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ظاہری روشنی دیکھنے کا تعلق ہماری بسر اوقات سے ہے اور ہم سست بھی ہوں تو مجبوراً کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہم بیرونی نور دیکھ سکیں اور اسے حاصل کر سکیں لیکن روحانی بقا میں انسان کو بسا اوقات محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ مر رہا ہے اور اس لئے وہ اپنے لئے لازم نہیں سمجھتا کہ میں ضرور اپنے نور کو چمکاؤں اور اپنی آنکھوں کو کھولوں یہی بڑی وجہ ہے کہ روحانی دنیا میں اندھیرے زیادہ ہیں اور ان کو صاف کرنا، ان کے پردوں کو چاک کر کے آگے نکلنا زیادہ محنت کو چاہتا ہے اور زیادہ شعور کو چاہتا ہے۔ جب تک شعور

بیدار نہ ہو اس محنت کی طرف توجہ پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اب دیکھیں دن میں پانچ مرتبہ ہم کھانا کھاتے ہیں یعنی ترقی یافتہ ملکوں میں پانچ دفعہ تو ضرور کچھ نہ کچھ منہ میں ڈالتے ہی رہتے ہیں اور اگر سارا دن پانچ دفعہ نہ کھائیں بلکہ دو دفعہ ہی کھائیں جس کو ہم روزہ کہتے ہیں تو کتنی مشکل سے وقت گزرتا ہے۔ ایسے سخت روزے بھی آتے ہیں کہ اس کا لمحہ لمحہ یاد کروا رہا ہوتا ہے کہ تم کسی چیز سے محروم ہو۔ مگر روحانی دنیا میں بعض لوگ عمر بھر نماز نہیں پڑھتے ان کو پتا بھی نہیں لگتا کہ ہم بھوکے ہو کر مر ہی چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بھوک کسی حد تک تو محسوس ہوتی ہے جب وہ موت میں تبدیل ہو جائے تو پھر کیسے محسوس ہوگی۔ اکثر تو غفلت کی حالت میں نہیں بلکہ موت کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر اس موت کا اور مادی موت کا ایک فرق ہے۔ مادی موت ایک دفعہ آجائے تو پھر ہمیشہ کے لئے چمٹ جاتی ہے اس سے انسان نکل نہیں سکتا لیکن روحانی موت اگرچہ موت کی ساری علامتیں رکھتی ہے یعنی کھائے پیئے بغیر انسان پھر بھی جیسے دنیا میں سانس لے رہا ہے یہ امکان رکھتا ہے اپنے اندر کہ پھر وہ آنکھیں کھول دے۔ پس روحانی موت کے مردوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب یہ رسول۔ اللہ کا رسول۔ محمد رسول اللہ ﷺ تمہیں بلائے تا کہ تمہیں زندہ کرے تو استجابت کیا کرو، لبیک کہا کرو۔ اب دیکھ لیں بظاہر تو ایک ہی قسم کی اصطلاحیں ہیں مگر ان دونوں میں فرق ہے۔ پس جب مثالیں دی جاتی ہیں یا اصطلاحیں پیش کی جاتی ہیں تو آنکھیں بند کر کے مادی اصطلاحوں یا مثالوں کو بعینہٖ روحانی اصطلاحوں یا مثالوں پر چسپاں کرنا بیوقوفی ہے۔ غور کر کے دیکھیں تو مضمون خود سمجھ میں آجائے گا۔ زندگی اور موت کی باتیں ہوتی ہیں مادی زندگی میں تو خدا کہتا ہے ایک دفعہ مر گیا تو کبھی زندہ ہو ہی نہیں سکتا۔ پس جہاں موت کی اور زندگی کی اکٹھی باتیں کرتا ہے وہاں ضرور روحانی زندگی مراد ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب عرض کیا رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (البقرۃ:261)۔

تو خدا نے مردہ زندہ کرنے کا گر سکھا دیا۔ صاف پتا چلتا ہے کہ وہاں روحانی موت مراد تھی، جسمانی موت کا تو حال ہی مختلف ہے۔

پس جہاں آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا کہ اے لوگو! جو ایمان لاتے ہو جب تمہیں یہ خدا کا رسولؐ بلاتا ہے تا کہ تمہیں زندہ کرے تو لبیک کہا کرو۔ تو وہاں بھی روحانی زندگی مراد ہے۔ تو ہر دفعہ

جو انسان بیرونی نیکیوں سے محروم رہتا ہے تو بعض دفعہ غفلت اور بعض دفعہ موت حائل ہو جایا کرتی ہے، جہاں تک موت کا تعلق ہے وہ تو دوبارہ اس مردے کا جی اٹھنا ایک غیر معمولی روحانی وجود کو چاہتا ہے اسی لئے انبیاءؑ کا سلسلہ جاری ہے۔ انبیاءؑ آتے ہیں تو پھر مردے زندہ ہونے شروع ہوتے ہیں۔ جب وہ نہیں ہوتے تو بسا اوقات غفلت سے پردے اٹھانے کے انتظام تو دیگر بزرگ بھی کرتے ہی رہتے ہیں مگر مردوں کو زندہ کرنے کی توفیق شاذ و نادر کسی کو ہوتی ہے۔ انبیاءؑ وہ ہیں جو ان غفلتوں کے پردے چاک کر دیتے ہیں، دبے ہوئے نوروں کو اٹھا دیتے ہیں، آنکھیں کھلنے لگتی ہیں، سوئی ہوئی حِسّیں جاگنے لگتی ہیں اور انسان پھر بیرونی نور سے رابطے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مضمون ہے جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام بیان فرما رہے ہیں کہ:

> جس کے آنکھوں کا نور نہیں وہ آفتاب کے نور سے بھی بے بہرہ رہتا ہے اور جس کو فطرتی نور کم ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی کم ہی ملتا ہے اور جس کو فطرتی نور زیادہ ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی زیادہ ہی ملتا ہے اور انبیاءؑ من جملہ سلسلہ متفاوتہ فطرت انسانی کے وہ افراد عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نورِ باطنی عطا ہوا ہے کہ گویا وہ نورِ مجسم ہو گئے۔

یہ مشکل الفاظ ہیں مگر جب بڑے مضمون کو کوزے میں بند کرنا پڑتا ہے تو پھر عام جو زبان ہے وہ متحمل ہی نہیں ہوتی اس کے لئے اعلیٰ درجے کی زبان جو عامۃ الناس کے لئے مشکل ہے اس کو استعمال کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جہاں سلیس اردو لکھتے ہیں وہاں حیرت انگیز خود روی کے ساتھ وہ زبان چلتی ہے اور ساتھ پڑھنے والے کو بھی بہاتی چلی جاتی ہے۔ جہاں بہت گہرے اور مشکل مضامین بیان ہونے ہوں وہاں آپؑ کی زبان اسی طرح مشکل ہو جاتی ہے اسے سمجھانا پڑتا ہے۔ **''سلسلہ متفاوتہ فطرت انسانی''** مراد یہ ہے کہ تمام فطرت انسانی کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی حال، ایک ہی صلاحیت، ایک ہی حدود اربعہ کے ساتھ پیدا نہیں کیا۔ فطرت انسانی نیک اور پاک تو ہے مگر کوئی چھوٹا ہے کوئی بڑا ہے۔ کہیں کوئی کوزہ ہے کہیں کوئی وسیع دریا کے بہاؤ کا برتن ہے یا ظرف ہے جس میں دریا بہتا چلا جاتا ہے، کہیں وہ سمندر کا ظرف ہے جو لامتناہی دکھائی دیتا ہے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پہ دیکھو تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔

تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ ایسا ہی انسانی فطرت میں خدا تعالیٰ نے مختلف صلاحیتیں، مختلف ظرف رکھے ہیں۔

’’اور انبیاءؑ وہ افراد عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نورِ باطنی عطا ہوا ہے کہ گویا وہ نورِ مجسم ہو گئے ہیں‘‘

اب نورِ مجسم کیا چیز ہے؟ نور تو جسم نہیں رکھتا۔ اگر اس بات کو سمجھیں تو پھر وحیءِ الٰہی اور انبیاءؑ کے عالی مرتبہ کا کچھ تصور دلوں میں باندھا جا سکتا ہے۔ جسم کے اندر مختلف صلاحیتیں ہیں اور ہر صلاحیت کا خدا تعالیٰ کی کسی صفت سے تعلق ہے اور اس صفت کے شکر کا حق ادا کرنے کا مضمون ہمیشہ انسان کو بعض نیکیوں کی طرف بلاتا ہے۔ آنکھ ہے، آنکھ کا بھی شکر ادا کرنے کا حق ہے۔ آنکھ پہلے خدا تعالیٰ کے نور کو دیکھنے، سمجھنے کی صلاحیت حاصل کرے۔ جن جگہوں سے روکا جا رہا ہے وہاں سے رکے جن جگہوں کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ دیکھو وہاں دیکھے۔ اس کا دیکھنا اور اس کے دیکھنے کی سچائی یہ سارے وہ مضامین ہیں جن کا آنکھ کے نور سے تعلق ہے۔ صرف ظاہری طور پر شعاعوں کے منعکس ہونے سے انسان نہیں دیکھ سکتا۔ جب روحانی دنیا میں بات کرتے ہیں تو یہ ساری باتیں آجاتی ہیں یعنی وہ مقام جہاں خدا فرماتا ہے رک جاؤ یہاں ٹھوکریں ہیں اگر آپ ان مقامات سے گزر جائیں اور وہ مقامات آپ کو دکھائی نہ دیں تو لازماً ٹھوکر کھائیں گے اور اسی کا نام اندھے کا بھٹکنا ہے۔ ظلمات میں بھٹکنے والے اسی طرح بے چارے ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ انبیاءؑ وہ ہیں جو نورِ مجسم ہو جاتے ہیں یعنی ان کے جسم کا کوئی ذرہ بھی ایسا نہیں رہتا جس کی صفات پر اللہ تعالیٰ کی مرضی کا نور جلوہ گر نہ ہو چکا ہو۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، ان کی ہر حرکت، ان کا ہر سکون خدا کے تابع ہو تو تب اسے نورِ مجسم کہیں گے نا۔ اس کے بغیر وہ نورِ مجسم کیسا ہو سکتا ہے اور جب نور ہر چیز کو ڈھانپ لیتا ہے تو گویا جسم غائب ہو گیا، جسم برتن بن گیا، اس برتن کو نور نے بھر دیا ہے اور پھر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جسم ہے اور یہ نور ہے۔ ان معنوں میں واقعۃً بندوں کے نورِ مجسم بنتے ہیں مگر ان بندوں کے جو بندگی کا حق ادا کرتے ہیں اور آنحضرت ﷺ بھی نورِ مجسم تھے۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ تمام انبیاءؑ نورِ مجسم تھے۔ نورِ مجسم ہوئے بغیر ان پر وحی کا نزول ہو ہی نہیں سکتا تھا اور نورِ مجسم ہونے

کے لحاظ سے ان میں اور حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ میں ایک فرق رہ جاتا ہے کہ ایک چھوٹا وجود نور مجسم بنا ہے یا ایک بڑا وجود نور مجسم بنا ہے۔ایک چھوٹا ظرف بھرا ہے یا ایک بڑا ظرف بھرا ہے۔ پیالہ بھی تو بھرتا ہے، کشکول بھی بھرتا ہے مگر وہ خزانہ بھی بھرا ہوتا ہے۔بسا اوقات جس سے لاکھوں کروڑوں کشکول بھرے جاسکتے ہیں ایک تالاب بھی بھرتا ہے اور سمندر بھی بھرتا ہے۔تو یہ کہہ دینا کہ انبیاءؑ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو شامل کیا گیا یہ گویا کہ نعوذ باللہ من ذالک رسول اللہ ﷺ کی تخفیف فرمائی، ہرگز درست نہیں۔

آپؑ یہ فرماتے ہیں کہ تمام انبیاءؑ نورِ مجسم تھے مگر ان سب نوروں سے بڑھنے والا نور حضرت محمد مصطفی ﷺ کا نور ہے کیوں کہ آپؐ کا ظرف بہت بڑا تھا اور جتنا بڑا ظرف تھا اتنی آپؐ کو محنت کرنی پڑی ہے اس لئے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدا کی دین تھی اس کو بنا دیا، اس کو نہ بنایا۔ یہ بات نہیں ہے۔جس کو جتنا زیادہ دیا اس کو اتنا ہی زیادہ محنت کرنا پڑے گی اسے بھرنے کے لئے۔کسی نے ایک گلاس بھرنا ہے، کسی نے جگ بھرنا ہے، کسی نے مٹکا بھرنا ہے، کسی نے پورا تالاب بھرنا ہے، کسی کو کہا ایسا سمندر بھر دو کہ کل عالم کی پیاس بجھا دو تمام بنی نوع انسان کا رسول تمہیں بنا کے بھیجا جا رہا ہے۔فرق تو ظاہر ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام اس کا ذکر کرتے ہوئے آگے اس مضمون کو بڑھاتے ہیں۔

> اس جہت سے قرآن شریف میں آنحضرت ﷺ کا نام نور اور سراج منیر رکھا ہے جیسا کہ فرمایا: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (المائدہ: 16)۔
> وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (الاحزاب: 47)

اور اللہ کی راہ میں بلانے والا اس کے اذن کے ساتھ جو سِرَاجًا مُّنِيْرًا ہے۔تو جو کل عالم کو نور بخشے اس کو سورج ہی کہنا چاہئے جب کہ کسی اور نبی کو سورج نہیں فرمایا گیا مگر سارے ہی روشن تھے۔سارے ہی سرتاپا روشن تر تھے۔کوئی ان کے وجود کا حصہ اندھیرا نہیں تھا مگر خدا نے ان کو جتنا ظرف دیا تھا وہ بھر گیا اس ظرف کو بھرنے میں ان کو نسبتاً آسانی تھی کم محنت کرنی پڑی اس لئے جزا سزا کا مضمون بھی اسی طرح جاری ہے انصاف کے ساتھ زیادہ دیا تھا تو زیادہ محنت کے تقاضے بھی تو

پورے کرنے پڑے اور جس نے سب تقاضے پورے کر دیئے اپنے ظرف کے مطابق بعینہٖ اس کی طاقتوں کے مطابق اس پر بوجھ ڈالا گیا لیکن جو فرق ہے وہ نمایاں فرق ہے۔ بہت سے اور پہلو بھی ہیں فی الحال میں ان کا ذکر چھوڑ رہا ہوں۔

آخر پہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کا خلاصہ یوں نکالتے ہیں، میں مضمون جو نور کے تھے بیان کروں گا لیکن اس موقع پر کیونکہ مضمون وہاں تک پہنچ گیا ہے جہاں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کی اس تحریر کا پڑھنا عین مناسب حال ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں۔

''وجود مبارک حضرت خاتم الانبیاء ﷺ میں کئی نور جمع تھے سو ان نوروں پر ایک اور نور آسمانی جو وحی الٰہی ہے وارد ہوا اور اس کے وارد ہونے سے وجودِ با وجود خاتم الانبیاء ﷺ کا مجمع الانوار بن گیا''

(براہین احمدیہ حصہ سوم، حاشیہ نمبر 11 روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 195)

وہ حوالہ ایک اور بھی ہے جو اس موقع پر بہت ہی برمحل چسپاں ہو رہا ہے لیکن اس وقت اس کی تلاش میں دقت پیش آ رہی ہے شاید اللہ کا منشاء یہی ہے کہ باقی مضمون کو آگے بڑھانے کے بعد پھر آخر پر ہی اس کو پیش کروں۔ اب وقت بھی چونکہ ختم ہو رہا ہے اس لئے میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں اور یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ جتنی باتیں میں نے کہی ہیں یہ گزشتہ رمضان کے حوالے سے کہی ہیں۔ ابھی وقت ہے کہ ہم ہاتھوں سے جاتے ہوئے رمضان کا جتنا حصہ روک سکتے ہیں روک لیں اور دامن پکڑیں کوشش کریں کچھ تو ہاتھ آ جائے۔ اس لئے یہ وقت سوچ میں اور فکر میں اور نفس کے مطالعہ میں اور کھوج میں خرچ کریں کہ رمضان آیا تھا، چلا بھی گیا، کچھ دقتیں لے کے آیا کچھ سہولتیں باقی چھوڑ گیا مگر دقتوں نے کچھ ایسی سہولتیں بھی عطا کی ہیں جو دائمی ہو چکی ہیں، جن کے نتیجے میں آپ کہہ سکتے ہوں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے کچھ ایسا تعلق قائم کر لیا ہے جو اب مجھ سے وفا کرے گا مجھے کبھی چھوڑ کے نہیں جائے گا۔ اگر اس مضمون پر غور کریں اور ہاتھ کچھ نہ آئے جیسے خالی برتن لے کے داخل ہوئے تھے ویسے خالی برتن ہو کے نکلے ہیں، اگر آپ کا غصے پر کنٹرول اتنا نہیں ہے ویسے ہی ہے جیسے پہلے تھا یعنی کوئی اس میں فرق نہیں پڑا۔ اگر نفس کی پیروی سے رکنے کی مزید طاقتیں نصیب نہیں ہوئیں، اگر نیکی کا ایسا لطف نہیں آیا کہ اور نیکیاں کرنے کو جی چاہنے لگے اور جو نیکیاں ہو گئیں ان کو چھوڑنے کو دل

نہ چاہے بلکہ رستے تلاش کریں کہ میں پھر دوبارہ ایسی ہی نیکیاں کروں، یہ مضامین ہیں جن پر غور کرنے سے آپ حقیقت میں اس دکاندار کی طرح ہوں گے جو سارا دن کی کمائی کے بعد رات کو بیٹھتا ہے، رات کے چراغ جلاتا ہے، دیکھتا ہے کہ کیا پایا اور کیا کھویا اور جو نہیں کرتا اس کو کچھ پتا نہیں چلتا۔

پس میں پسند نہیں کرتا کہ جماعت غافلین کی جماعت ہو۔ہم نے دنیا میں بہت سے ایسے کام کرنے ہیں جن کی توفیق غافلوں کو مل نہیں سکتی۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے دیکھو سِرَاجًا مُّنِيْرًا کی تعریف کے ساتھ داعی الی اللہ کے مضمون کو جیسا کہ قرآن نے فرمایا باندھ کر نمایاں طور پر دکھایا ہے۔داعی الی اللہ کے لئے سراج منیر ہونا ضروری ہے، اس داعی الی اللہ کے لئے سراج منیر ہونا ضروری ہے جو سب دنیا کو بلا رہا ہے جو سب دنیا کو روشنی کی طرف بلاتا ہے روشنی دے گا تو بلائے گا نا۔جس کی اندھیروں تک رسائی ہی نہیں ہے وہ کیسے لوگوں کو کھینچ کر روشنی کی طرف نکالے گا۔پس آنحضرت ﷺ داعی الی اللہ بنائے گئے اس لئے اللہ فرماتا ہے سِرَاجًا مُّنِيْرًا بنائے گئے۔طبعی تقاضا تھا دعوت الی اللہ کا۔

ہماری جماعت آج یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ ہم داعی الی اللہ بنائے گئے ہیں تمام دنیا کے انسانوں کو محمد مصطفی ﷺ کے نور سے منور کرنے کے لئے۔اب دامن میں کچھ نور ہوگا تو لے کے چلیں گے نا اور کچھ نہیں ہے تو اپنے رومال میں جگنو ہی اکٹھے کر لئے ہوتے۔وہ کچھ روشنیاں چھوٹی چھوٹی جو چمکتی بھی ہیں اور بجھ بھی جاتی ہیں اگر زیادہ اکٹھی ہو جائیں تو اس سے بھی کچھ رستہ دکھائی دینے لگتا ہے تو نور کی تلاش کریں۔تب داعی الی اللہ بنیں گے اور نور کو محفوظ کریں اور اس نور کو پھر چمکائیں اور صیقل کریں تا کہ آپ کے آگے آگے بھاگے جیسا کہ قرآن کریم فرما رہا ہے آپ کا رستہ بھی صاف کرے تو دشمن بھی دیکھے تو جان لے کہ نجات اسی میں ہے کہ اس صاحب نور کے ساتھ چلیں۔جب اندھیرے گھیر لیں، رستے خطرناک ہوں تو کوئی ایک صاحب چراغ بھی ہو سب اکٹھے ہو کر اس کے پیچھے چلتے ہیں اس کا دامن پکڑتے ہیں اس کے ساتھ قدم پر قدم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ خود اپنا نقصان ہے، تو ایسے چمکتے ہوئے نورانی وجود کے طور پر دنیا کے سامنے ابھریں جہاں آنحضرت ﷺ کے سراج منیر کا کچھ حصہ موجود ہو۔

سراج منیر کا لطف یہ ہے کہ سراج منیر ہر نور پیدا کرتا ہے، وہ شمع جو جلائی جاتی ہے وہ بھی

سورج کے نور سے بنی ہوئی ہے وہ تیل جس کی طاقت سے ہوائی جہاز اڑائے جاتے ہیں اور بڑے بڑے کارخانے قائم کئے جاتے ہیں وہ بھی سراج منیر سے بنا ہوا ہے اور سِرَاجًا مُّنِيْرًا کی آگ سے نہیں سِرَاجًا مُّنِيْرًا کی روشنی سے۔ میں پہلے بھی یہ مضمون آپ پر کھول چکا ہوں میں صرف حوالہ دے رہا ہوں اس حوالہ کو ذہن میں یاد رکھیں کہ نور الٰہی ہے جو سورج میں بھی چمکا ہے اور سورج اس نور کا پردہ ہے خود نور الٰہی بذات خود نہیں ہے لیکن وہ پردہ چمک اٹھا ہے نور الٰہی سے۔ آنحضرت ﷺ وہ نور کا پردہ ہیں۔ جس میں خدا اس شان سے چمکا ہے کہ گویا وہی خدا دکھائی دینے لگے۔ یہ مضمون ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سِرَاجًا مُّنِيْرًا سے کچھ نور مانگیں۔ اپنی جھولی اس کے آگے پھیلائیں اس نور سے اپنا کوئی گوشہ تو منور کریں۔ اگر پیار اور محبت سے آپ نے محمد رسول اللہ ﷺ کا نور مانگا اور اپنایا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ نور اپنے اردگرد بھی نور کے لئے جگہیں پیدا کرنا شروع کر دے گا اس نور میں بڑھنے کی صلاحیت ہے اس نور میں پھیلنے کی صلاحیت ہے اور پھر آپ کا سفر حقیقت میں زندگی اور نور کا سفر ہوگا پھر آپ کا سفر بے ثمر نہیں رہے گا۔

دعوت الی اللہ کے پھل جب ایسے داعیین الی اللہ کو لگنے لگتے ہیں جو نور کی روشنی لے کر چلتے ہیں تو اس نور سے وہ بھی حصہ پاتے ہیں ورنہ بسا اوقات اندھی تبلیغ سے بھی کچھ لوگ احمدی ہو جاتے ہیں اسلام قبول کر لیتے ہیں مگر وہ بھی مردہ مردہ سے رہتے ہیں، ان میں جان نہیں پڑتی۔ آپ وہ نئے ہونے والے مسلمان بنائیں آپ وہ نئے ہونے والے احمدی پیدا کریں جو آپ کے نور سے منور ہوں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے نور کا ایک جلوہ ہے اور آپ کی زندگی سے ان میں بھی جھلکنے لگے۔ آپ کی قربانی کی روح ان کے دل میں بھی دھڑکنے لگے۔ اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔ اس کے بغیر دنیا زندہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے بغیر اس دنیا کے اندھیرے تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین